عراق وعجم پر ہندوستانی فن کا اثر

از ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، لاہور

ہمارے محترم دوست مولوی محمد عبداللہ صاحب چغتائی اپنے علمی اور تحقیقی مقالات کی وجہ سے ہندوستان کی علمی سوسائٹی میں روشناس ہیں دو سال ہوئے کہ علمی تحقیق کے سلسلہ میں آپ پیرس تشریف لے گئے تھے۔ وہاں کے قیام میں آپ نے تاج محل پر ایک محققانہ کتاب فرنچ زبان میں لکھی جس کو وہاں کے ارباب علم نے بہت پسند کیا اور اسی سلسلہ میں آپ کو ڈاکٹری کی ڈگری اور ایک معقول رقم بطور انعام دی گئی۔ تھوڑے دن ہوئے کہ آپ ہندوستان واپس آگئے ہیں اور حسب سابق اپنی علمی تحقیقات میں مصروف ہیں "برہان" میں اشاعت کے لیے آپ نے مقالہ ذیل ارسال کیا ہے جو الیسٹرن آرٹ امریکہ کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے۔ ہم اس کو شکریہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی درخواست ہے کہ ہمیں اپنے دوست سے اس سے زیادہ کی توقع ہے۔ "س"

ہیروڈوٹس[1] نے دارائے اول بن ہسٹاپیز (Hystespes) (ولادت قریب ۴۸۵ سنہ و وفات ۵۲۱ سنہ ق م) کی فتح وادی اٹک کا حال لکھا ہے[2] اور راجستان کے کتبات اس اطلاع کی

[1] Herodotus (۴۰۸ سنہ ۴۸۴ سنہ ق م) قدیم یونانی مورخ ہے بعض نے اس کو ابوالتاریخ کہا ہے اس نے ایشیائے کوچک مصر و شام وغیرہ کا سفر کیا اور اپنے مشاہدات کی بنا پر اپنی تاریخ لکھی۔ مترجم

[2] تاریخ ہیروڈوٹس ص ۲۰۱ و ص ۲۴۴ -

تصدیق کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی ہیروڈوٹس یہ لکھتا ہے کہ دارا دریائے اٹک سے آگے نہیں بڑھا۔ ایرانی اور عرب مصنفین دارا کا نام بیان نہیں کرتے بلکہ اٹک کی فتح کو گستاسپ سے منسوب کرتے ہیں جس نے اپنی حکومت اپنے ایک پوتے بہمن کے سپرد کردی تھی۔ اس ایرانی شہزادے نے اٹک ڈیلٹا کے شمال میں ایک شہر بہمن آباد اپنے نام پر آباد کیا اور خود اپنے جد امجد کی وفات پر ایران واپس چلا گیا اور تخت نشین ہوا بہمن کی وفات کے بعد اس کا لڑکا ساسن بہمن آباد گیا اور ایران کی حکومت اس کی بچی کے سپرد ہوگئی۔ یہ ساسن اردشیر ساسانیوں کا ابوالآباء تھا۔ جب عرب ۷۱۱ئ میں پہلی مرتبہ وادی اٹک میں آئے، تو انہوں نے شہر بہمن آباد کو جو اس وقت موجود تھا، اپنا دارالحکومت بنا لیا۔

ہندوستانی تہذیب نے ایران پر جو اثرات کئے ہیں اخمینی دور میں ہم کو ان کا سراغ نہیں ملتا اس وقت اخمینی دربار کی تہذیب جو قدیم مشرقی روایات کی وارث تھی اچھی طرح مستحکم ہوچکی اور نشوونما پاچکی تھی۔ اس بناء پر اسے کسی خارجی محرک کی ضرورت نہ تھی علاوہ ازیں کوئی ایسا اثر ہم تلاش نہیں کرسکے جو قبل اشوک اخمینی دور کے نشانات کے مشابہ ہو۔ یہ نشانات اول تو ملے ہی کم ہیں اور جو ملے بھی ہیں ان میں کوئی چیز مفید مقصد نہیں۔ اس کے برخلاف ایرانی فنون جن کی داغ بیل بہمن آباد میں پڑی انہوں نے قدیم فن بدھ مت اور دورِ اشوک کے فن کو بیحد فیضیاب کیا۔

سلوکس اور ہندوستان کے ہمعصر بادشاہوں کے درمیان کیا تعلقات تھے؟ اس سلسلہ میں ہمیں چندر گپت بانی خاندان موریا اور سلوکس نکوتار کے درمیانی تعلقات کا علم ہے کہ پہلے وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے اور بعد میں دونوں متحد ہوگئے تھے اور یہ اتحاد اس واقعہ سے اور مستحکم ہوگیا کہ سلوکس نے ہندوستان کے بادشاہ کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ سلوکس نے اپنے داماد کو وہ صوبہ دیا تھا جو وادی اٹک اور ہندوکش کے درمیان تھا گویا زیادہ تر جدید افغانستان۔ یونانی میگستھنز نے سلوکس کے ایلچی کی حیثیت سے پاٹلی پتر کو اپنا مستقر قرار دیا جو چندر گپت کی جائے

سکونت تھی۔ اس نے اپنی تزک میں اس شہر اور دربار کی بہت مفید تفصیلات دی ہیں جس کے مشہور حصے اب بھی محفوظ ہیں۔ ہند سے ارشاسد کے تعلقات اُن تمغہ جات کے ذریعہ جن کی ایرانی اور ہندی خصوصیات واضح ہیں، ثابت ہوتے ہیں۔ مگر ارشاسیدی آثار کی کمی مشرقی ایران میں کسی اثر کے اثبات پر اثرانداز ہوتی ہے۔ اسی طرح ساسانی دور سے قبل ہندی اثر ایران میں نہیں ملتا۔ اشوک کے درباری مذہب "بودھ مت" اور یونانی فن کے باعث شمالی ہند میں تہذیب و تمدن کو بہت فروغ ہوا۔ ساسانیوں کو مشکل سے رومیوں، بازنطینیوں اور عربوں نے ہندوستان پر حملہ کرنے سے روکا۔ بہرام گور (۴۲۱-۴۳۸ق م) نے چاہا کہ پوشیدہ طور سے ہندوستان کا سفر کرے بیان کیا جاتا ہے کہ یہاں آکر بہرام گور نے واسودیو کی لڑکی سے شادی کی تھی جس کی رہائش تمراپور میں تھی۔ اور واپسی پر ہندوستان سے بارہ ہزار ماہرینِ فن موسیقی و رقص اور دوسرے ماہرینِ فنون جن میں عورتیں اور مرد دونوں شامل تھے، اپنے ہمراہ ایران لے گیا تھا[1]

اگرچہ نوشیرواں اور خسرو (۵۳۱-۵۷۹ء) کی مہمیں تاریخ سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتیں تاہم ہمارے سامنے معاصر مصنفین کی بہت سی علامتیں ہیں جو اُس عہد کے ہندوستانی اور ساسانی بادشاہوں کے تعلقات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ وشاپور کے دربار میں ایک ہندوستانی طبیب رہتا تھا[2] خسرو اوّل نے اپنے لیے پنچ تنتر (کلیلہ دمنہ) کو حاصل کیا جو دراصل ہندوستانی فہم وادراک کی روشن دلیل ہے۔ اور اُسی کے زمانہ میں ہندوستان سے شطرنج آئی[3]۔ پولکسیان (ایرانی پوروشیا) بادشاہ مہاراشٹر نے ایک ایلچی خسرو ثانی کے ہاں ۶۲۵ء میں مع تحائف کے بھیجا جو خسرو اور اس کے لڑکے کے لیے تھے[4]۔ یہ تحائف ایک ہاتھی ایک تلوار، ایک سفید باز اور ریشم کے کپڑے پر مشتمل

[1] یہ تعداد جیسا کہ عموماً مشرقی قصوں میں پایا جاتا ہے بہت مبالغہ آمیز ہے۔ [2] طبری مطبوعہ یورپ ص ۸۲۴ [3] تاریخ راج ترنگی مطبوعہ پیرس ص ۶۴۲۔ [4] میں نے غار ۱ کے اجنٹا کے نقوش کو دیکھا ہے۔ یہ ایلچی اجنٹا کی نقاشی میں عیاں ہے اور فن کے اعتبار سے بالکل ایرانی نژاد ہے۔ بلکہ تمام ماحول ہی ایرانی ہے اور بعض محققین کی رائے ہے کہ اجنٹا کے کام میں ایرانی

تھے۔ اور خسرو کے جانشین شیرویہ نے ان کو وصول کیا۔ اس کے جواب میں ایران سے پلکسیان کے ذریعہ ۶۲۶ء میں ایک ایرانی ایلچی ہندوستان میں آیا جس کا ثبوت غار ہائے اجنٹا نمبر اول کے دیواری نقوش سے ملتا ہے جو بحالات موجودہ ایک عمدہ تصدیق ہے۔ تاہم ساسانی وفد میں ایران کے فن پر ہندوستان کا کیا اثر ہوا۔ اس کا ثبوت طاق بوستاں کے شکار کے کندہ مناظر سے ملتا ہے[1]۔ کندہ ہاتھیوں کے علاوہ جو محض ہندوستان سے جا سکتے تھے۔ فن کے اعتبار سے بھی یہ نقوش بہت سے ہندوستانی نشان ظاہر کرتے ہیں۔ اگرچہ متذکرہ نقوش کا یہ غیر منقطع مظاہرہ دراصل ایک ہی تصویر میں ایک ہی شکل کا بار بار تکرار ہے۔ ایک ایسا طریقہ تھا جو قبل ازیں اشوری لوگ عمل میں لاتے تھے۔ اور مغربی یونانی فن نے اسے اختیار کیا۔ ڈاکٹر ہیرزفیلڈ نے کہا ہے کہ یہ کندہ نقوش دراصل رنگین تھے[2] اور ان میں ساسانی نقش و نگار کی بہت کچھ جھلک پائی جاتی ہے۔

ہم ان نقوش کو اپنے ذہن میں تصوری میں تبدیل کر دیں تو ہندی دیواری نقش و نگار کے ساتھ ان کی مشابہت ظاہر ہو جاتی ہے۔ بادشاہ کا گھوڑے پر سوار ہونا اور اس کے پیچھے ایک چتر بردار کا کھڑا ہونا۔ اجنٹا کی عام تصویر ہے۔ بادشاہ کے سر کے اردگرد ہالہ کا ہونا (جو کسی حد تک مصور کیے گئے ہیں، اگرچہ وہ طباعت میں نمایاں نہیں ہیں) ساسانی فن میں ایک نئی چیز ہے۔ اور اجنٹا میں اس کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ مگر سب سے زیادہ حیرت انگیز مصوریں ہاتھیوں کی ہیں جو نہایت کاریگری اور عمدہ طریق سے ڈھالی گئی ہیں۔ یہ صورتیں یقیناً ہندوستانی صناعوں کی صنعت ہیں جو ان جانوروں میں رہنے سہنے کے باعث اس بات کی صلاحیت رکھتے تھے کہ ہاتھیوں کی خاص خاص صفات کو بہتر طریقہ پر نمایاں کر سکیں۔ اس کے علاوہ غول کے

[1] یہ کتابیں مطبوعہ ہیں۔ [2] سفیر ایشیا مطبوعۂ برلن۔ ص ۹۹۔

خول کو ایسا مصور کرنے کی قابلیت سانچی کے آثار سے ہمارے علم میں آتی ہے[1]۔

ایران و ہند کے تعلقات و مراسم عربوں کی حکومتِ ایران کے زیر سایہ زیادہ بڑھے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کی اسلامی فتح محمد غوری کے عہد میں ہوئی جس نے ۱۱۹۲ء میں تھانیسر میں ہندوؤں کو شکست دی تھی۔ مگر مسلمان اس سے پہلے بھی اول صدی ہجری میں وادی اٹک اور صوبۂ گجرات میں داخل ہو چکے تھے۔ اور پھر محمود غزنوی کے ماتحت بھی ہندوؤں سے ربط ضبط کا موقع ملا[2]۔ یہ دونوں مہمیں اسلامی ممالک کے لئے بہت ہی اہم تھیں۔ اول عراق کے لیے، دوسری خراسان کے لیے اور دونوں حالتوں میں ہندوستانی فن کا طوفان مغربی اسلامی دنیا تک پہنچا۔ اور اُس کا اثر اسلامی فنون و ثقافت پر ہوا جس کا اثر اب بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے[3]۔

جس زمانہ میں دمشق اور بغداد دنیائے اسلام کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ ہندوستانی فن و ثقافت نے اٹک کے ڈیلٹا کی راہ سے سمندر کے ذریعہ خلیج فارس تک اپنا راستہ بنایا۔ اس کے بعد محمود غزنوی اور بعد کی قوموں کے ماتحت تہذیب جدید نے افغانستان اور خراسان تک اپنی شاہراہ قائم کی۔

عربوں نے اس سے بھی بہت پہلے خلیفہ ثانی حضرت عمر کے زمانہ میں کوشش کی تھی کہ ہندوستان میں قیام پذیر ہو جائیں۔ گجرات، سورت اور سندھ کے ساتھ تجارت کی غرض سے بصرہ قائم کیا گیا تھا۔ حضرتِ عثمان نے وادی اٹک کی جستجو کا حکم دیا تھا۔ مزید فتوحات حضرت علی کے ماتحت ظہور میں آئیں۔ بنو اُمیہ کے عہد میں یزید اوّل اور عبد الملک کے زمانہ میں بھی

---

[1] تاریخ فرشتہ ترجمہ از برگز جلد اوّل۔ [2] یہ امر تسلیم کرنے میں کچھ تامل ہوتا ہے۔ کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ عام طور پر فاتح کا اثر مفتوح پر ہوتا ہے جس کے آثار آج تک ڈاکٹر وینیر کے بیان کے برعکس ملتے ہیں۔ مترجم۔

[3] یہ سب فنی خصوصیات ہزارہا سال قبل عراق، بازنطینی اور مصر کے فنوں میں پائی جاتی ہیں۔ اغلب یہ ہے کہ یہاں سے براہِ ایران ہند میں پہنچیں نہ کہ ہندوستان میں پہلے تھیں اور پھر وہاں سے ایران میں گئیں۔ مترجم

قدرے عارضی کامیابی ہوئی۔ خلیفہ ولید کے زمانہ میں سندھ اور ہمسایہ ملک فتح ہوچکا تھا اور کچھ راجے مہاراجے باجگزار بنا لیے گئے تھے۔ محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ کے بادشاہ کو مطیع کرلیا تھا۔ اور سندھ بہت زمانہ تک مسلمانوں کے ماتحت رہا۔ مسجدیں سب سے پہلے ملتان میں تعمیر ہوئی تھیں۔ ابن عمر تغلبی (قریب ۸۵۰ء) سندھ کا حاکم تھا[۱]۔ اُس نے اپنا مقامِ استقرار جزیرہ بکھر کے ملک میں بناکر پڑوس کے قصبہ ارور کو اپنے لیے جائے رہائش قرار دیا جس کو منصورہ کہا جاتا تھا۔ ہارون رشید نے اپنے دوسرے بیٹے مامون کو خراسان، زابلستان، کابلستان، سندھ اور ہندوستان کے دیگر حصص مفتوحہ سپرد کیے۔ اس طرح ایک خاص مشرقی ہندوایران سلطنت قائم ہوئی جس پر سندھ کی اعلیٰ تہذیب کا اثر ہوا جو دراصل اٹک ڈیلٹا کا ایک صوبہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ دوسرے ملک بہت جلد ہاتھ سے جاتے رہے لیکن سندھ خلیفہ متوکل علی اللہ (۸۴۷-۶۱ء) کے زمانہ تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔

خلفاء عباسیہ کے ان دو دوروں میں ہندوستانی ثقافت کا جو اثر بغداد پر ہوا پروفیسر اڈورڈ سکھاؤ نے ان دونوں میں فرق بتایا ہے۔ وہ اوّل تو خلیفہ منصور (۷۵۴-۷۵ء) کے زمانہ سے تطبیق دیتے ہے۔ جبکہ بغداد اور سندھ کے درمیان زبردست راہ و رسم تھی۔ اور ہندی فن و ادب[۲] کے قدم بغداد تک پہنچ چکے تھے اور عربوں نے علمی نظامِ نجوم سے واقفیت پیدا کرلی تھی۔ دوسرا دور ہارون رشید (۷۸۶-۸۰۹ء) سے شروع ہوتا ہے جبکہ برمکی خاندان کو فروغ حاصل ہونا شروع ہوگیا تھا۔ یہ لوگ بلخ سے بغداد میں عباسی حکومت کے بانی کے ہمراہ آئے تھے۔ ان کا ایک بزرگ بودھ مت کے عبادتخانہ نوبہار بلخ میں واعظ تھا۔ بغداد میں برامکہ واقعی مسلمان ہوچکے تھے۔ مگر ان کے کسی معاصر نے کبھی ان کے اسلام لانے کے متعلق زیادہ خیال نہیں کیا، اور نہ اُن کے اسلام کو کبھی خصوصیت کے ساتھ کوئی زیادہ اہمیت دی گئی۔ انہوں نے بغداد میں ہندوستانی اطبار کو بلایا اور اُن کو اپنے شفاخانوں کا مہتمم

---

[۱] تاریخ ہند ایلیٹ ص ۴۴۲ ج ۱

[۲] یہاں غالباً مصنف کو دھوکہ ہوا ہے۔ مترجم

بنایا اور اُن سے ہندوستانی طب، عطاری، سمیات، فلسفہ، اور دوسرے علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرایا۔
پروفیسر سکھاؤ کے اس بیان پر ہم ابن ندیم کی کتاب الفہرست کے بیانات کا اضافہ کرتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ برامکہ مانوی مذہب سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اس طرح وسط ایشیا کی تہذیب مانوی کے لیے بغداد کے دروازے خود بخود کھل گئے ہونگے[1]۔ مسعودی کا بیان ہے کہ مامون کے ماتحت اس شہر کے لوگوں نے ایرانی، ہندی اور یونانی کتابوں کا ترجمہ کرنا شروع کیا[2]۔ اور اس زمانہ کے متعلق ابوالفدا، کا بیان بھی یہی ہے[3]۔ پروفیسر سکھاؤ کو حق ہے کہ بغداد کی ذہنی نشوونما پر ہندی اثر کو ثابت کرنے کے لیے اُن تمام کتابوں کے نام لکھے جن کے اس زمانہ میں تراجم ہوئے لیکن فنون کے میدان میں ہم ایسے خوش نصیب نہیں ہیں۔ اگرچہ منطقی استدلال سے یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ یہ اثر محض ذہنی تہذیب تک ہی محدود نہیں تھا۔ ضابطۂ شریعت (یعنی مفتوح صوبوں پر کار گزاروں کا بھیجنا ضروری ہونا) ہندوستانی صوبوں پر بھی عائد تھا جو امویوں اور عباسیوں کے زیر اثر تھے۔ لیکن کسی ہمعصر مورخ نے اس امر کو مفید بحث نہیں سمجھا کہ ہندوستان کے فن تعمیر، اور فنون آرائش کا بغداد پر اثر کس حد تک ہوا۔ ہمارے وقت کی تاریخ کا اولین فرض ہے کہ ہم اپنے طریق تشریح کی حصص مشترکہ کو چن لیں۔ پہلے اس قسم کی کوشش جنرل ڈی میلی نے کی[4]۔ مثال کے طور پر اس نے بخارچہ اور شرفہ ہندوستانی اصلیت کے ثابت کیے ہیں جو مسلمانوں کے گھروں کی بناوٹ کے خاص ضروری حصے ہیں[5]۔ اسی طرح بغداد اور مصر میں عباسیوں، طولونیوں اور فاطمیوں کے دور میں لکڑی پر جو منبت کاری ہوئی وہ بھی ہندوستانی فن سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ یہ درست ہے

[1] کتاب الہند۔ البیرونی۔ ترجمہ سکھاؤ	[2] مسعودی ص۱۳۳	[3] ابوالفدا ص۱۲۹ ج۱
[4] فن تعمیر ہندو مشرق اقصیٰ میں۔ مطبوعہ پیرس	[5] یہ حصص تعمیرات پہلے سے ہی مصر میں پائے جاتے تھے، جبکہ ہندوستان میں ان کا کہیں وجود بھی نہیں تھا۔ البتہ مسلمان ہندوستان میں آئے تو ان چیزوں کو ساتھ لیتے آئے۔ اس سے قبل ہندوستان کا کوئی ایسا فن تعمیر ہی نہیں تھا جو ذکر کیا جائے۔ مترجم۔

کہ مصر میں تبطیوں کے زمانہ سے پہلے بھی منبت کاری پائی جاتی تھی، اگر وہ ہندوستانی اثر کے بغیر اس قدر بلند معیار تک مشکل سے ہی پہنچی ہوگی۔ لکڑی کے منبت شدہ دروازے جنہیں محمود غزنوی متھرا سے غزنہ تک لے گیا تھا۔ معاصرانہ حیثیت سے قدیم فن کے نمونے تھے[1]۔ اسی طرح قیروان کا منبر بغداد میں منبت ہوا جو بیشمار صنعت سنگتراشی کے نمونوں سے لبریز ہے[2]۔ مرکب تہذیب کو ثابت کرنے کے لیے ہم اس سے مشکل سے ہی کوئی دلیل پیش کر سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اب تک کوئی شہادت اس امر کی نہیں ملی کہ اس کے اصل نمونہ کی اصلیت قدیم ہندوستانی منبت کاری سے ماخوذ ہے کیونکہ سندھ میں آج تک اس قسم کا نمونہ کبھی کسی نے نہیں پایا۔ اور اس کے برعکس بہت سے نمونے اسلامی کہے جا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے بہت سے زیبائشی نمونوں کی شناخت پر ہی اکتفا نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ ہندوستان نے ابتدائی فن اسلامی کو اپنی قدیم روایات ہنرمندی سے بڑی حد تک مستحکم کیا ہے[3]۔ مگر محض ہندوستان نے ہی نہیں، بلکہ بازنطینی اثر کو بھی ایک بڑی حد تک دخل تھا

ہمیں محسوس کرنا چاہیے کہ دستکار لوگ اپنے اصول کو فوراً بدل دیتے تھے جب وہ غیر ملک میں کام کرتے تھے۔ اگرچہ خود کسی حد تک اپنی مقامی روایات پر بھی کاربند رہتے تھے[4]۔ یہ تمام ہنرمندی کی روایات نہیں جنہیں باہر سے لایا گیا چنانچہ منبر کی جالی کا کام ایسا ہی ہے جیسا کہ ہم عربی گھروں کے بخارچوں میں پاتے ہیں۔ ڈی بیلی نے ثابت کیا ہے کہ یہ کام بھی ہندوستان سے لایا گیا تھا۔ بقیہ نمونوں کی تعداد جو عراق کے لیے مقامی تھی مقابلۃً اُس مختلف الانواع جالی سے کم

---

[1] یہ تاریخی اعتبار سے غلط ثابت ہو چکا ہے بلکہ مسلمانوں نے اپنا خاص انداز فن لکڑی کی منبت کاری میں پیدا کیا اور محمود غزنوی کے زمانہ کا فن منبت کاری زیادہ تر عباسیوں اور ابن طولون کی منبت کاری کے نمونوں سے ملتا ہے۔ مترجم

[2] اسلامی فنون از ڈیمنیرٹ ۲۴۔ [3] کوئی خاص طرز فن جس نے اسلامی فن پر اثر کیا ہو بیان نہیں ہو سکتا کیونکہ ابتدا میں مسلمان بیرونجات سے متاثر ضرور رہے مگر انہوں نے اپنا طرز خاص اسلامی وضع کیا۔

[4] یہی حال اطالوی تعمیر کاروں کا تھا۔ اور اس سے تو ان کی ہمہ گیر جذبۂ فن کی شہادت ملتی ہے۔

"مترجم"

سے کم ہے۔ قیروان کا منبر ابتدائی دورِ عباسیہ کے لکڑی کے کام کا نمونہ ہے۔ اور وہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔

مسلمانوں کی فتوحات کا ایک نیا دور دولتِ ترکیہ غزنیہ سے شروع ہوتا ہے سبکتگین (۹۷۶-۹۹۷ء) جو دراصل حکومتِ غزنیں کا بانی ہے اُس نے خُراسان اور شمالی ہندوستان پشاور تک مطیع کیا اور دوبارہ سلطنت ہند و ایران قائم کی جس کے باعث ہندوستانی تہذیب ایران میں مداخلت کرنے سے نہیں رُک سکتی تھی سبکتگین کے لڑکے محمود کو اس سے پہلے ہی خلیفۂ بغداد کی طرف سے خراسان اور غزنہ عطا ہو چکے تھے۔ اس نے ۱۰۰۱ء اور ۱۰۲۴ء کے درمیان بارہ حملے کیے۔ اِسی طرح اُس نے اپنی حکومت کو کشمیر، پنجاب، قنوج، متھرا اور گجرات سورت تک بڑھایا[1]۔ لیکن پنجاب میں اسلامی حکومت رہی اور گجرات کو وہیں کے ایک راجہ کے سپرد کر دیا۔ مورخ فرشتہ نے بیان کیا ہے کہ محمود غزنوی کس قدر ہندوستان کے فن تعمیر و تہذیب سے متاثر ہوا، یہاں تک کہ متھرا کی تاخت و تاراج کے بعد اُس نے غزنیں کے حاکم کو مبالغہ آمیز الفاظ میں ایک خط لکھا اور اُس میں متھرا کی عمارتوں اور اُس کی شان و شوکت کی بہت تعریف کی۔ اُسی میں وہ لکھتا ہے "یہاں کی ایک ہزار عمارتیں مومن کامل کے ایمان کی طرح مضبوط ہیں۔ اور یہ سب کچھ یونہی نہیں ہو گیا بلکہ کئی لاکھ دینار کے خرچ سے بھی دو صدیوں تک کوئی اور شخص ایسی عمارتیں نہیں بنا سکتا"۔ محمود غزنوی پانچ ہزار تین سو قیدی غزنہ لایا۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے اکثر و بیشتر لوگ معمار و دستکار[2] تھے مرمر اور سنگ خارا کی عظیم الشان مسجد تعمیر کی جو عروسِ فلک کے نام سے مشہور رہے اور جس کو اُس نے اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر تعمیر کرایا تھا[3]

---

[1] لین پول کی کتاب مسلمان حکومتوں کی جدولیں ص ۲۸۶ [2] یہ غلط ہے کیونکہ محمود نے غزنہ میں جو کچھ تعمیریں کرائیں فرگسن محقق فن تعمیر کا خیال ہے کہ اُن میں بنی طولون کی شباہت پائی جاتی ہے اور فن تعمیر کا یہی دورہ اصل اسلامی ہندوستان کے فن تعمیر کا نمونہ ہے۔ مترجم [3] فرشتہ ترجمہ برگز ص ۵۹ و ہیول فن تعمیر ص ۱۲

کچھ عرصہ بعد محمود کی حکومت لاہور سے سمرقند و اصفہان تک پہنچی مگر ایرانی صوبوں کو اس سے پہلے ہی ۱۰۵۰ء میں آلِ سلجوق لے چکے تھے۔

غزنہ کی ان عظیم الشان عمارتوں کا کچھ زیادہ حصہ باقی نہیں رہا علی الخصوص وہ جو ہندوستانی نمونوں کے تتبع میں تعمیر ہوئی تھیں[1]۔ اب بھی دو عالیشان مینار "فتح" موجود ہیں۔ ایک محمود نے تعمیر کرایا اور دوسرا مسعود ثالث (۱۱۱۴-۱۰۹۹ء) نے ان کو دیکھ کر ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ غزنہ میں یہ فن اپنے خاص دنوں میں کیا تھا۔ ان کی بنیادی سطح کی ستارہ نما شکل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مینار ہندوستانی نمونوں سے متاثر ہیں۔ اگرچہ ان کی نقاشی بالکل اسلامی ہے[2]۔ مزید برآں محمود کی مرمریں قبر کا تعویذ کوفی کتبات سے مزین ہے۔ یہ قبر کھلے صحن میں ہے۔ مسلمان اپنے بزرگوں کے لیے قبے بنایا کرتے تھے لیکن اس کے برخلاف ہندوستانی کھلے میدان کو ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ بادشاہ اکبر نے بھی سکندرہ (آگرہ) میں اپنی قبر کا تعویذ نہایت عظیم الشان مقبرہ کی چھت پر کھلی فضا میں بنوایا ہے[3]۔ محمود کے روضہ کا دروازہ جو حرم کی جانب تھا ایک مشہور لکڑی کے طاقوں سے مزین کیا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے انگریز حاکم ان کو ۱۸۲۲ء میں لے آیا تھا تاکہ پورے طور پر محفوظ ہو جائیں[4]۔ ان پر عربی کتبات کے حلقے بنے ہوئے تھے۔ اور اُن کو اسلامی ماحول کے مطابق کرلیا گیا تھا۔ روضۂ محمود کی قبر کے بالائی حصہ کی تجدید غزنوی دور کے انحطاط کے بعد غوریوں (۱۱۴۸-۱۲۱۵ء) کے ہاتھوں ہوئی آخر کار اُس کے تنگ

---

[1] ثابت ہو چکا ہے کہ غزنہ میں ایک عمارت بھی ایسی تعمیر نہیں ہوئی جس میں ہندوستانی طرز کا شائبہ ہو۔ مترجم

[2] غزنہ از گوڈرڈ و فلوری ۱۹۲۵ء یہ مینار کپٹن کرسویل نے اپنے طویل مضمون "ارتقاءِ اسلامی مینار" میں دیے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ یہ خالص اسلامی ہیں اور مصر کی عمارتوں سے ماخوذ ہیں۔ فن ہند کا شائبہ بھی نہیں، مترجم

[3] سکندرہ کے متعلق عرض یہ ہے کہ تزک جہانگیری کے بیان کے مطابق یہ عمارت نامکمل رہ گئی ہے۔ ورنہ اس پر گنبد ہونا چاہیے تھا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ہندوستان میں سکندرہ جیسی کوئی ہندو عمارت نہیں ملیگی جو یہ کہا جائے کہ سکندرہ اس کی نقل ہے۔ مترجم۔ [4] لارڈ ایلین برا (۴۴-۱۸۴۲ء) غزنہ سے مفروضہ سومنات کے دروازے لایا لیکن دراصل ان کو سومنات کے مندر سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ ان پر خالصتاً اسلامی منبت کاری تھی۔ مترجم۔

اطراف میں سے ایک طرف ایک منبت شدہ کتبہ سہ نقطہ محراب کے حاشیہ سے بنایا گیا ہے[1] یہ اور دیگر محرابوں اور قبروں کے تعویذ جو ہندوستانی محرابوں سے بنائے گئے ہیں۔ ثابت کرتے ہیں کہ غزنہ پر ہندوستانی فن نے کتنا اثر کیا تھا[2]

غور کے افغان ایک مختصر خود مختار قوم تھی جو فیروزکوہ اور بامیان پر غزنویوں کے ماتحت حکمراں تھی۔ ان دونوں میں ازدواجی تعلقات کی وجہ سے اتحاد تھا۔ مگر بعد میں ایسے حالات پیش آگئے کہ غوریوں نے غزنہ کو پامال کرکے رکھ دیا، اور اُس کو فتح کرکے افغانستان پر چھا گئے۔ محمود غوری نے ایک سلطنت قائم کی اور خراسان کا کچھ حصہ سلجوقیوں سے فتح کیا۔ پھر ہندوستان پر حملوں کا سلسلہ شروع ہوا اور سندھ و متھرا پر غلبہ پایا۔ جہاں عرب عمال نے اسلامی حکومت نافذ کی تھی۔ اُس نے اپنی آخری واپسی پر لاہور میں ۱۱۸۶ء میں غزنویوں کو مغلوب کیا۔ چوہان راجپوتوں کے قائد اعظم پرتھوی راج والیِ اجمیر پر حملہ کی غرض سے بڑھا۔ تھانیسر کی جنگ راجپوتوں کی شکست فاش پر انجام پذیر ہوئی غوریوں نے اپنی فتوحات سے قریب قریب تمام شمالی ہند کو مطیع کرلیا۔ یہ سب سے پہلا زمانہ تھا جبکہ کم وبیش تمام ہندوستان نے اسلامی غلبہ کو قبول کیا[3]۔ اس طرح ہند و ایران کے مزاج سے مرکب ایک حکومت قائم ہوئی۔ ہندوستانی فن کا اثر اب بھی برقرار رہا۔ ہندوستانی حملوں نے نئے حاکم کو دولتِ وافر بخشی اور اس سے محمود کی عظیم الشان جامع ہرات کے ہمسر ایک مسجد تعمیر کرائی جس کی تفصیل موہن لال ہندوستانی نے بیان کی ہے[4]۔ مسجد کا ایک دروازہ ستر قدم کا تھا جس کی چھت مضبوط ستونوں کے سہارے کھڑی تھی، صحن کو چار ایوان گھیرے ہوئے تھے جو ستونوں کے ذریعہ

---

[1] ہندوستان میں مسلمانوں سے قبل کوئی ایسا قدیم محراب فن معماری تھا ہی نہیں، یہاں مسلمان آئے اور اُن کے فن نے ہندوستان پر اُلٹا اثر کیا۔ [2] یہ فن تعمیر کی ایک اصطلاح ہے۔ کمان یعنی Arch اور قبر محمود پر جو کتبات ہیں اُن کے متعلق عرض ہے کہ اُن کا خط کوفی نہیں ہے جیسا کہ صاحبِ مقالہ نے سمجھا ہے بلکہ اصل میں خط بدیع و نسخ کا مرکب ہے۔ مترجم۔ [3] لین پول ص ۲۹۲ [4] جنرل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال بابت ۱۸۴۳ء ص ۱۶۔

کماندار ستونوں سے ملحق اور چھوٹے چھوٹے قبوں سے مسقف تھے یہ ایوان ایرانی طرز کے تھے مگر ستونوں کا کمانداراستہ مع قبوں کے ہندوستانی تھا[1]۔ یہ ثبوت اب بھی تربت شیخ جام کی مسجد میں مشرقی خراسان میں تلاش کیا جا سکتا ہے[2]۔

لیکن محمد غوری ۱۲۰۶ء میں قتل کر دیا گیا۔ سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔ ۱۲۱۵ء میں خوارزم شاہ ایرانی ممالک کا وارث ہوا تو غوریوں کی سلطنت کو غلاموں نے دہلی میں بطور دارالسلطنت کے سنبھالا۔ اور ایران و ہندوستان کے درمیان جو سیاسی اتحاد تھا وہ زائل ہو گیا۔ پھر مختصر سا اتحاد تیمور کے کشمیر اور دہلی کے حملوں سے ہوا۔ اس کی فتوحات نے حکومتِ ماوراءالنہر کو بہت اہمیت تک پہنچایا۔ جو اُسے پہلے کبھی حاصل نہیں تھی۔ سمرقند ایک ایسی سلطنت کا دارالحکومت تھا جو دہلی سے دمشق اور بحیرۂ یورال سے خلیج فارس تک وسیع ہو چکی تھی[3]۔ ہندوستان کے عظیم الشان فنِ عمارت نے تیمور کو بہت محظوظ کیا، چنانچہ محمود کی طرح وہ بھی بیشمار کاریگر اپنے ہمراہ لے گیا۔ بعض ماہرینِ جرِ اثقال اور دوسرے کاریگر جن میں سے اکثر کی خدمات کو شاہی خاندان کے شہزادوں اور شہزادیوں کے محلات کی تعمیر کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ انہوں نے جنگوں میں بھی حصہ لیا اور جو لوگ سمرقند میں رہ گئے تھے اُن کی خدمات ماتحت شعبوں اور حرم شاہی کے لیے وقف ہوئیں، مگر تیمور نے واپسی پر خیال کیا کہ اپنے دارالخلافت میں تراشیدہ پتھر کی ایک جامع مسجد تیار کرائے[4]۔ اس مقصد کے لیے خاص خاص فرامین صادر کیے گئے کہ تمام کاریگر جو پتھر یا مرمر کے کام میں خاص ماہر ہیں اُن کو شاہی ملازمت کے لیے محفوظ کر لیا جائے[5]۔ شرف الدین علی یزدی "ظفرنامۂ تیمور" میں اس مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ پتھر کا کام کرنے والے دو سو آدمی جن میں ایرانی تھے اور آذربائیجانی اور ہندوستانی بھی۔ وسیع

[1] تاریخ فن تعمیر ہند فرگسن صفحہ ۱۸۹ و صفحہ ۳۳۵ جلد ۲۔ [2] خراسان۔ جرمنی۔ از ڈینر صفحہ ۸ [3] لین پول صفحہ ۲۶۶
[4] غالباً فیروز شاہ کے کوٹلہ کی مسجد اور مسجد قوت الاسلام مراد ہے۔ مترجم [5] روضۃ الصفا ترجمہ انگریزی صفحہ ۲۶۶/۲

صحن میں کام کرنے پر متعین کیے گئے تھے، اور گاڑیوں کے کھینچنے کے لیے ہاتھی استعمال کیے جاتے تھے۔ مسجد کے چار سو اسّی ستون تراشیدہ پتھر کے تھے اور محرابوں کی وسیع پیشانیاں نہایت عمدگی کے ساتھ تراشیدہ، صیقل شدہ، مرمری سلوں سے مزین کی گئی تھیں۔ ابھرے ہوئے منبت شدہ کتبات سے تمام دیواروں کی سطح اندرونی و بیرونی طور سے آراستہ تھی۔ اور صرف یہ سطح ہی نہیں، بلکہ محرابوں کے کماندار راستے بھی جن کو پتھر یا ابھری ہوئی اینٹوں سے جوڑا گیا تھا۔ بہزاد کی تصاویر ظفر نامہ [1] سنہ ۱۴۶۷ء اب تک محفوظ ہے، اُس میں بھی یہ تفصیلات بالا مذکور ہیں، اور اُس میں پتھر تراشنے والے ہتھوڑہ اور چھینی سے مرمری سل پر منبت کاری کرتے دکھائے گئے ہیں [2]۔ اس سے واضح ہے کہ حجر سازی کا ہندوستانی طریق فن یہاں بھی برتا جاتا تھا، اور ویسی ہی ترتیب نقاشی میں مقصود تھی۔ اس کا ثبوت دہلی اور اجمیر کی مساجد سے بھی ملتا ہے جن کی دیواریں ابھرے ہوئے بیل بوٹوں، اور کتبات سے بالکل بھری ہوئی تھیں۔ اور جن کی مثال گوالیار کے مندروں کی دیواروں سے واضح ہوتی ہے [3]۔ اب سمرقند میں اس مسجد تیمور کا بھی کہیں نام و نشان باقی نہیں ہے۔

تیمور تک ہندوستانی اثر ایران پر ختم ہو چکا تھا۔ اور تیمور کی عظیم الشان مسجد کے باوجود تیموری فن تعمیر ایران میں خالصتاً ایرانی الاصل رہا۔ یہاں تک کہ ایران کے فن نے شاہانِ مغل کے فن کو آگرہ اور دہلی میں فیضیاب کیا۔ (ترجمہ از مقالہ ارنسٹ ڈینر مطبوعہ سالنامہ ایسٹرن آرٹ امریکہ)

(نوٹ) یہاں یہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں آئے تو فن تعمیر میں جو طرز اُنھوں نے اختیار کیے وہ سب اپنے ساتھ عراق و عجم سے لائے۔ اور اُن کو ہند میں رائج کیا، اور یہ سب طرز ہندوستانی طرز سے الگ ہیں۔ خاکسار مترجم نے اسی موضوع پر گذشتہ دسمبر میں انڈین سوسائٹی لندن کے رسالہ Indian Art and Letters میں بعنوان Indian links with central Asia - Architecture ایک مضمون شائع کرایا تھا جس میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

[1] ظفر نامۂ تیموری ترجمۂ فرانسیسی مطبوعہ پیرس ۱۷۲۲ء [2] شُلز کی کتاب ایرانی مصوری [3] یہاں صاحبِ مقالہ کو غالباً دھوکا ہوا ہے۔